

سے وفانہ کی تو ایک غیر مجھ سے کیونکر ہمدردی کرے گا؟“

جمیل اس کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ ”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ شاید میں ایسا ہی ہوں اور واقعی میں ایسا ہی ہوں کیونکہ لوگ مجھے ایسا ہی خیال کرتے ہیں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں۔ میرا جی کرتا ہے کہ اگر میں ایسا ہوں بھی تو ویسانہ رہوں۔“

تیلما نے اپنے اسی چھوٹے سے رومال سے آنکھیں پوچھیں اور اپنی اور گل کی داستانِ محبت سنانے لگی کہ کس طرح ان دونوں نے ایک دوسرے سے شادی کے وعدے کیے۔ کیسے وہ ایک رات ٹھپپ چھپا کر گر جبے میں پہنچ اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر محراب کے سامنے فسیں کھائیں۔ اپنا گھر سجانے کے لیے کن کن چیزوں کی فہرست بنائیں۔ اپنے باغیچے کو سنوارنے کے لیے کیسے کیسے پھولوں اور پودوں کا انتخاب کیا اور جس شام تیلما اپنے مستقبل کے گھر میں آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لیے ایک ٹک بک خرید کر لائی، گل نے ایک ایک مشتری سے شادی کر لی اور وہ دونوں بمبئی پلے گئے۔

اور میری پیاری بچیو! اسی طرح دلاتے دیتے دیتے اور اس کے غم کو اپنا غم بناتے بناتے جیل کو تیلما سے محبت ہو گئی۔ وہ اکٹھے سینما جاتے۔ ریسٹوران میں اکٹھے کھانا کھاتے اور سیر و تفریح کے لیے اکٹھے باہر نکلتے۔ رفتہ رفتہ تیلما کے غم کا سارا زہر جیل نے چوس لیا اور وہ بالکل تند رست ہو گئی اور جب وہ تند رست ہو گئی تو اپنی حیسیوں میں گپتیں اڑانے لگی اور زور زور سے بننے لگی اور اسے میری سعدی کی سہیلیو! جب وہ ہنسنے لگی تو اسے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس کی بھی میں شرکت کرے اور اس کی بھی جس پہلے آدمی سے نکرائی تھی، وہ سوائے جیل کے اور کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنی ٹک بک ٹرینک سے نکالی اور آنے والے مہمانوں کی مدارات کے لیے اچھے اچھے کھانوں پر نشان لگانے لگی۔

جس دن تیلما جیل کو اس کے کمرے میں ایک بند لفافہ دے کر جاتی ہوئی باہر بھاگ گئی تو جیل کا دل چاہا کہ کاش اس نے زبیدہ سے وعدہ نہ کیا ہوتا۔ کاش اس کی زندگی میں نجمہ وار وہ نہ ہوتی تو تیلما سے شادی کی درخواست کرتا۔ اور جب لفافہ کھلا تو

تیلما کی طرف سے شادی کی درخواست تھی۔ زبیدہ سے اس نے وعدہ کر کھا تھا۔ نجمرہ اسے پیاری لگتی تھی اور تیلما بے سہارا تھی اور ان تینوں کے درمیان جیل کیا تھا؟ اس کے متعلق نہ میں اس وقت سوچ سکتا تھا۔ اور نہ ہی اب سوچ سکتا ہوں۔ کچھ اس طرح سے تھا۔ کہ۔۔۔ نہ وہ گھبرا ہوا تھا، نہ پریشان تھا، نہ غمزہ تھا اور نہ ہی راضی۔ وہ کچھ یوں تھا۔ لیکن میں بھی کیا کروں۔ مجھے کوئی مناسب لفظ ملتا ہی نہیں مگر اس کمرے کی فضائوں کیا ہوا؟ مٹھنڈی ہوا کے جھونکے زکر کر کیوں آرہے ہیں؟ اس کی دیواریں سکڑتی جا رہی ہیں۔ تمہیں نیند آرہی ہے اور تمہاری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ تم میں سے کئی اٹھ اٹھ کر چلی بھی گئی ہیں۔ اور جو باقی ہیں۔ جو باقی ہیں۔۔۔ لیکن یہ آواز کیسی؟ یہ پکار کس کی؟ شاید میری کوئی بچی نہیں سو گئی ہے۔ خیر! خیر۔ اور جیل کسی کو بتائے بغیر جہلم کے ایک سکول میں ماشر لگ گیا۔۔۔ پگے محلے کے جس چھوٹے سے مکان میں وہ زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ریٹائرڈ سب پوسٹ ماشر رہتے تھے۔ یہ صحیح اٹھ کر شریف کے پڑوں پپ پر شترنخ کھینے چلے جاتے اور شام ہوئی گھروپاں آتے۔ جیل ہمیشہ ان کے ہاتھ میں بزری کا ایک تھیلا دیکھا کرتا۔ وہ شام کے وقت اگلے دن صحیح کوپکانے والی چیزیں خرید لایا کرتے۔ جیل گلی کے موڑ پر یا پڑوں پپ کے پہلو سے گزرتے ہوئے انہیں بڑے ادب سے سلام کیا کرتا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیتے۔ صحت کے بارے میں پوچھتے۔ سکول کی دلچسپیوں کا تذکرہ لے بیٹھتے اور تازہ خبریں پوچھا کرتے۔ ان کی شکل مولانا شوکت علی سے بہت کچھ ملتی تھی۔ وہی چہرہ دیتے ہی مولٹے موٹے نقش، دھات کے فریم کی عینک، سر پر قراقلی ٹوپی، سفید فرنچ کٹ واڑھی، وضع سے ذہانت کے آثار نمایاں تھے مگر ان کی صحت ایسی اچھی نہ تھی۔ اکثر کسی نہ کسی عارضے کی لپیٹ میں آئے رہتے۔ پوسٹ ماشر صاحب بڑے خلیق آدمی تھے اور ان کی بیوی بھی اچھے کھلے دل کی عورت معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے تھے۔ ارشاد اور بلقیس۔ ارشاد یہ ہی کوئی بارہ برس کا ہوا گا اور بلقیس کوئی پیچیں کے لگ بھگ۔ جیل نے بلقیس کو دیکھا تو نہ تھا مگر اس کی موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ شام کوٹھے پر آ کر بڑے دردناک لبھے میں میر کی ایک غزل پڑھا کرتی اور جب وہ یہ شعر پڑھتی۔۔۔

ہر سو سر تسلیم رکھے صید حرم میں  
وہ صید لگن تن بکف کب ادھر آوے

تو یوں محسوس ہوتا جیسے کہ اہر ہی ہوا اور آخری شعر پر پہنچ کر تو وہ واقعی روئے  
لگتی۔ ارشد جمیل کے سکول کا طالب علم تو نہیں تھا لیکن وہ سوال سمجھنے کے لیے ہر روز  
اس کے پاس آنے لگا۔ ایک دن باتوں میں جمیل نے ارشد سے بلقیس کے بارے  
میں پوچھ ہی لیا۔ اس نے بتایا کہ پانچ سال ہوئے بلقیس آپا کی شادی اس کے پچھیرے  
بھائی حسن میر سے ہوئی تھی جو اپنی شادی کے تیرے میں تپ محرك سے چل بے  
تھے۔ اب اجی نے کئی مرتبہ آپا کی دوسری شادی کے لیے کہا مگر وہ ہر بار ایسی بات سن کر  
روئے لگ جاتیں اور کئی کئی دن کھانا نہ کھاتیں۔ اس پر اب نے اس سلسلے میں گفتگو ہی بند  
کر دی۔ جمیل کو آپا سے ہمدردی ہو گئی اور اب وہ میر کی غزل کو ایک دکھے دل سے سُنْتے  
لگا اور اس کے دل میں آپا کی بد نصیبوں کا ایک جالا ساتنا جانے لگا۔ شب برات کو  
پوسٹ ماسٹر صاحب کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آسکے۔ ناچار انہوں نے کھانا شروع کر دیا  
اور جب جمیل ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا تو آپا نے دروازے کے قریب آکر کہا۔ ”آپ  
کے پاس اتنے رسائے آتے ہیں مگر آپ نے ایک بھی نہ بھیجا۔“ جمیل کوئی جواب نہ  
دے سکا اور کتنی دیر تک ایسے ہی ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پھر اچانک اس نے چونک کر کہا۔  
”آپ نے کبھی ملکوایا ہی نہیں۔ میں بھیجا بھی تو کیسے؟“

آپانے کہا۔ ”میں نے کئی بار ارشد کو کہا مگر اس نے شاید آپ سے ذکر نہیں کیا۔“

”تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔“ جمیل نے دروازے کی طرف نگاہیں

اٹھا کر جواب دیا۔ ”اور پھر آپ کو میر پسند ہے اور میرے پاس میر کا کوئی دیوان نہیں۔“

آپا پہلے تو کتنی دیر خاموش کھڑی رہی پھر وہاں سے چلی گئی۔

اور پھر میری پیاری بچو! ایک دن کوئے پر بلقیس نے جمیل سے کہا۔ ”تم مرد  
بڑے بڑے وفا ہوتے ہو۔ جس نے ساری عمر مجھ سے تھادی نینے کا وعدہ کیا تھا، وہ مجھے چھوڑ

کر رہا پوچھ ہو گیا۔ تم نے زبیدہ سے شادی کرنے کا اقرار کیا اور اس وعدے کو پورا نہ  
کیا۔ تم نے میرے غنوں کو جانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا سہارا شاید اس لیے نہ

بن سکے کہ میں بیوہ ہوں۔ وہ چنگاری جو برسوں کی راکھ تلے دبی پڑی تھی، تم نے پھونکیں

مار مار کر پھر روشن کر دی اور اب اس چنگاری پر تم اپنے آنسو گرا کر اسے ہمیشہ کے لیے بجھا دینا چاہتے ہو۔ لیکن تم یہاں آئے ہی کیوں؟ تم نے اس شہر میں قدم ہی کیوں رکھا؟ کیا وہ سر زمین جہاں تمہارے جیسے لاکھوں ہی مرد پھرتے ہیں، ایک اور جھوٹے اور فربی کا بوجھ نہ سہار سکتی تھی؟ کیا تم ہاں سے اس لیے بھاگ آئے کہ غریب زبیدہ پوروں میں مہندی رچا کر اور مانگ میں صندل بھر کر وہاں آگئی تھی؟“

اور جمیل کا بت اس کوٹھے پر کھڑا تھا اور اس خول کے اندر ایک سنگر مشین کے شتل کی طرح گھوم رہا تھا۔ زبیدہ نجہہ۔ نجہہ تیلما۔ تیلما بلقیس۔ بلقیس زبیدہ۔ اور اس کے پتھر کے بت کے اندر کئی لہو بھرے دل مخدود ہو کر نگین ہوئے چاہر ہے تھے۔ دھنیے جذبات کی کتنی ساری لہریں پھٹھر پھٹھر کر فولاد کی سلاخیں بنتی چاہری ٹھیس۔ چار نسوں نی ہاتھ مشین کی ہتھی بڑے زور سے کھماڑ ہے تھے اور اندر شتل بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا لیکن یہ نگینی اور یہ فولادی سختی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی اور جمیل جمیل ہی رہا۔ بے وفا۔! سنگدل! جھوٹا اور فربی!

اور میری پیاری بچیو! یہ قصہ بہت پر انا ہے۔ اس بات کو کئی برس بیت چکے ہیں اور جمیل معلوم نہیں کہاں ہے۔ کسی کو بھی اس کا علم نہیں لیکن پتہ نہیں میں اس کی جدائی کیوں محسوس نہیں کرتا تھا؟ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر دم میرے ساتھ ہو، میرے پاس ہو۔ اور میرا ہاتھ بٹا رہا ہو۔ مگر ان آخری ایام میں میں نے بھی اسے کھو دیا۔ اب مجھے اس کی آواز آ رہی ہے۔ وہ کسی بتوں میں چیزوں چیزوں کر رہا ہے۔ مجھے بلا رہا ہے لیکن مجھے پتہ نہیں لگتا کہ یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے اور وہ کہاں ہے۔ مگر اسے میری پیاری بچیو! اس کمرے کو کیا ہو گیا؟ آتشدان کی آگ کو کیا ہوا؟ اور یہ کھڑکی کس نے بند کر دی؟ تم کہاں ہو؟ میری بچیو؟ کدھر ہو؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں یا تمہیں نیند آگئی ہے؟ یا تم یہاں آئی ہی نہیں اور میں یوں نبی بولتا چلا گیا۔ دیکھو میرا کمبل پھسل کر پاؤں میں گر گیا ہے اور اس کمرے کی دیواریں میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہیں اور فضا اس فشار میں مجھے چیزوں چیزوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اندھرا بھیلتا چاہرہ ہے اور فضا گھٹتی چاہری ہے۔ تم کہاں ہو میری بچیو! کہاں ہو تم؟ بچیو! میری بچیو۔ یہ چیزوں چیزوں کون کر رہا ہے۔ بچیو۔ بچیو۔ میری بچیو!

## تو شے ملے

و سط جنوری میں جب فرخ نے قتل کا پہلا مقدمہ جیتا تو اس کی شادی ہو گئی اور نیا جوڑا ہمنی موں منانے کے لیے مری روانہ ہو گیا۔

پرانی وضع کی نیکسی راستے میں دو مرتبہ خراب ہوئی اور کئی بار پانی لینے کے لیے زکی۔ ڈرائیور ہر چشمے پر اس کا ریڈی ایٹر ٹھنڈے پانی سے بھرتا لیکن چند میل کی چڑھائی کے بعد انہم خراب ہو جاتا اور بھاپ کے بادل ٹنک فضا میں دودھیا بھٹکلوں کی طرح تیرنے لگتے۔ مری سے چھ میل اوہر سڑک کے کناروں پر کہیں کہیں برف پڑی تھی جس پر پہلوں سے اٹھنے والی گرد کے غلاف چڑھے تھے۔ جیسے جیسے نیکسی اور پر چڑھتی سڑک کے دونوں جانب میالی ڈھیریاں ایک دوسرے کے قریب ہوتی جاتیں۔ مریں دلہن کو پھریاں لیتے دیکھ کر فرخ نے کملن کی تہہ کھولی اور اس نے اپنی بیوی کی ٹالگوں پر پھیلا دیا۔ پورے چودہ سال بعد آج لڑکی کو اپنے گاؤں کا قبرستان نظر آرہا تھا جس کے کنارے بے شمار چھوٹی چھوٹی برجوں کے درخت تھے اور ان درختوں کے قریب قطار اندر قطار بہت سے شیرخوار بچوں کی قبریں تھیں۔ شام کے وقت گذریے جب اپنے ریوڑ واپس گاؤں لاتے تو یہ نہیں ڈھیریاں گرد سے اٹ جاتیں اور ان پر اُبھرے ہوئے روڑے گرد کی چادروں تلے دب جاتے لیکن صرف یہ ہی بات نہیں تھی۔ وہ لڑکی ٹھنڈ کی وجہ سے بھی کانپ رہی تھی!

جب نیکسی ایجننسی میں پہنچی اور ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تو باہر کی روشنی اندر نہ آسکی۔ موڑ کے اندر اور باہر ایک سامان تھا۔ آسمان پر اودے اودے بادلوں کے درمیان یہاں وہاں قمریزی قناتوں کے انبار لگے ہوئے تھے جنی میں کچھ نہیں

تھیں، کچھ پرانی اور چند ایک بالکل دریدہ و بو سیدہ!  
مال روڈ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے فرخ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”تمک تو نہیں گئی  
ہو؟“

اور دلبhen نے اس کی طرف دیکھئے بغیر کہا۔ ”نہیں جی۔“  
”جمیل صاحب کا ہٹ ذرا دور ہے۔“ فرخ نے سمجھدار خاوند کی طرح کھلتے  
ہوئے کہا۔ ”کوئی بیس ایک منٹ کی چڑھائی اور ہو گی۔“  
اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

ہٹ بہت بڑا نہیں تھا۔ صرف تین کمرے تھے۔ ایک چھوٹا غسل خانہ اور  
ایک مختصر سا باورچی خانہ! سب سے بڑا کمرہ خواب گاہ تھی۔ اس میں دو بلنگ بچھے تھے اور  
کونے میں سیاہ رنگ کی ایک گول مول میز پڑی تھی۔ خواب گاہ کے پہلو میں ایک  
مستطیل کمرہ تھا جہاں دیوار کے ساتھ چار پائیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پاس ایک بڑے  
آئینہ والی سنگار میز رکھی تھی جس کے ساتھ شیش کی ایک وارڈ روپ ایستادہ تھی اور  
فرش پر تین کرسیاں بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑی تھیں جن پر میلے کپڑے جھاڑنوں کی  
طرح پڑے تھے۔ اس کمرے میں دروازے کے علاوہ ایک دریچہ بھی تھا جس کے پشت  
باہر ڈھلان کی طرف کھلتے تھے۔

فرخ نے یہاں آتے ہی سارے کمروں کی بتیاں جلا دیں اور اپنی بیوی کو  
ساتھ لے کر ہر کمرے کا معاشرہ کروا تا پھرا۔ جب وہ بستر کھول رہے تھے تو فرخ نے  
کہا۔ ”میرا جی چاہتا ہے کہ ہم بھی ایک ایسا ہی ہٹ بناؤ میں۔ کوئی بھی موسم ہو، چند دن  
اپنی مرضی کے مطابق سکون سے بسر کیا کریں گے۔“

اس کی بیوی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے مسکراتے ہوئے  
اپنے گھر کے شیشوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا جہاں گول مٹول لذو سے دو بنے کھیل  
رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں وہاں سے بٹالیں اور بستر کھولنے میں مصروف ہو گئی۔  
جب بستر بچھے تھے تو فرخ نے جگ انھا کر کہا۔ ”میں نیچے جا کر چائے کے لیے  
دو دھلاتا ہوں۔ پھر بہت اندر ہیرا ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے۔ آج بر قباری بھی شروع ہو  
جائے۔“

اس کی بیوی نے نگاہیں اٹھا کر کچھ کہنا چاہا مگر وہ بول نہ سکی۔ فرخ نے اور درتے کوٹ کے کالر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈر تو نہیں لگے گا؟“ اس کی بیوی نے ڈرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جی۔“

جب وہ دروازہ کھول کر پھر میلی گینڈنڈی پر باہر نکلا تو اندر ہیرا چاروں طرف چھا چکا تھا اور پہاڑوں کی تخت بستہ چٹپٹیوں کے گرد برفلی ہوا چٹکھاڑی تھی۔ اس کے جاتے ہیں دہن نے اندر سے چھٹپٹی چڑھا لی اور ہیٹر لگا کر کھانا گرم کرنے کی تیاری کرنے لگی۔ کھانے کی گول میز پر گرد جمی ہوئی تھی اور اس پر کیڑوں کے چلنے پھرنے سے آڑی ترچھی لکیریں اور مکمل نامکمل دائرے سے بن گئے تھے۔ جھاڑن لینے کے لیے وہ ساتھ کے کمرے میں گئی تو اوارڈ روب کی قربی کر سیوں سے سویٹر بُتی ہوئی لڑکی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ فرخ کی بیوی ہڑ بڑا کر بھاگنے لگی تو اس لڑکی نے مسکرا کھا۔

”اگھر یہ نہیں میں آپ کی پڑوسن ہوں، ابھی ابھی میں یہاں سے گزری تو اس کمرے میں روشنی دیکھ کر میں نے اندر جھانکا۔ یقین مانیے میں بد تیز نہیں ہوں لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے نہ صرف چٹپٹیوں میں سے اندر نگاہ دوڑائی بلکہ دریچہ کھول کر اندر بھی آگئی۔“

فرخ کی بیوی خوف سے کپکا رہی تھی اور پہاڑ کی چوٹی پر برفلی رات کے سنانے نے اس کپکا پہٹ کو لڑے میں تبدیل کر دیا۔ اس لڑکی نے ویسے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو بہت سردی لگ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میٹھ جائے، پھر اتنی سردی نہیں لگے گی۔“

فرخ کی بیوی خواب میں چلنے والے انسان کی طرح قدم اٹھانے لگی اور سنگار میز کی طرف ہو لے ہو لے یوں بڑھی جیسے ازدھے کے کھولے ہوئے منہ کی طرف آہو پچہ لپکتا ہے۔ جب وہ میز کے کونے پر میٹھ گئی تو اس لڑکی نے کہا۔ ”میں نے آپ کو اور آپ کے شوہر کو موڑ سے اترتے دیکھا تھا اور مال روڈ پر آپ کے شوہر کا یہ جملہ بھی سنا تھا کہ تم تھک تو نہیں گئی ہو؟ مجھے عام عورتوں کی طرح مرد بُرے نہیں لگتے۔ اس لیے آپ کا خاوند بھی بُرًا نہیں لگا اور جب اس نے یہ فقرہ کہا تو میرے دل میں اس کی عزت دوچند ہو گئی۔ ایک ایسے ہی آدمی کے لیے میں زندگی بھر انتظار کرتی اور جی، ہی

جی میں اسے آوازیں دیتی رہی۔ میری پکار کے جواب میں اس کی آواز بڑی دور سے آیا کرتی جیسے مچھلیاں پکڑنے کے لیے کسی اندر ہر رات کو سمندر میں بہت آگے چلا گیا ہو۔ میں ساحل پر کھڑی اسے آوازوں پر آوازیں دیتے جاتی۔ وہ ہر آواز کا جواب بڑی محبت سے دیتا مگر واپس نہ آتا۔ میرے رشتہ کے بہت سے پیام آئے مگر میں تو صرف اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر کسی اور کے لیے پوروں میں مہندی کیوں رچاتی!! ابی میرے اس روئے سے بہت نالاں تھے مگر میں چونکہ ان کی مرحوم اور چھپتی بیوی کی ایک ہلی نشانی تھی، اس لیے وہ بظاہر مجھ سے ناراض نہ رہتے۔ اول اول میں ضدی تھی، پھر خود سر بوجائی اور بعد میں میرے ارادے ناقابل تحریر ہو گئے۔ ”پھر اس نے سویٹر بننا چھوڑ کر نگاہیں اور اٹھائیں اور کہا۔ ”آپ آرام سے بیٹھ جائیں، اس طرح آپ کے پاؤں سو جائیں گے۔ اب تو آپ کو سردی نہیں لگ رہی؟“

فرخ کی بیوی نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا اور وہ لڑکی کہنے لگی۔ ”میں اپنے خاندان کے نوجوانوں سے محبت کرنے کی اس لیے قائل نہ تھی کہ ساتھ رہتے رہتے یونہی سا ایک لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے جس کا محبت کے تصور سے دور کا بھی واسطے نہیں۔ میں تو چاہتی تھی کہ ملک چشم سے اچانک ایک شہزادہ آئے۔ میں پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لوں اور پھر تھلوں میں اس کی ڈاپی کے نقوش پا پر بھاگ بھاگ کر بگولا بن جاؤں یا پسین کے کسی اکھاڑے میں وہ بل فائنسنگ کے لیے نکل۔ تماشا یوں میں اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑے اور وہ خونخوار چوپائے سے عافل ہو جائے جو اسے سینگوں پر اٹھا کر ہوا میں اچھا دے، پھر جو ہو سو ہو۔ وہ زندہ رہے یادم توڑدے مجھے میرا گوہر مقصود مل جائے اور میں نے اپنی جاہل سہیلیوں سے کہا تم نہستی ہو لیکن ایک دن وہ آئے گا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ہوں گے۔ ہونٹوں پر پیڑیاں جھی ہوئی ہوں گی۔ وہ ہمارے خیمہ کے پاس آ کر کہے گا۔ ”میں بھی پیاسا ہوں اور میری ناقہ بھی پیاسی ہے۔ حدی خوانی میں میرا گلا سوکھ گیا ہے اور ناقابل برداشت بوجھ سے میری او ننھی کی تانگیں کانپ رہی ہیں۔ مجھے پانی پلاو، مجھے کھانے کے لیے کچھ دو۔“ پھر اچانک اس کی نگاہیں میرے ہاتھوں پر پڑیں جن پر شہد کے پیالے نان شیر سے ڈھانپے پہلے سے اس کی منتظر ہوا کروں۔ میرے کندھے پر چشمے کے نہنڈے پانی کا مشکیزہ لٹک رہا ہو اور میری آنکھوں

میں نخلتا نوں کا تلطیف ہو لیکن میری یہ بات سن کر میری جاہل سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور دیر تک ہنسی رہیں مگر ان کی بُخی زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہ دے سکی اور ایک دن وہ آہی گیا۔ اس نے برآمدے میں آکر مجھی بجائی اور میں نے دروازہ کھول کر اسے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا جھینپا، گھبرا یا اور پھر ابی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے کہا وہ ابھی تک کچھری سے نہیں لوٹے۔ آپ پیام دے جائیے۔ شام کو آئیں گے تو میں ان سے کہہ دوں گی۔ اس نے ویسے ہی گھبراتے ہوئے کہا۔ ”وہ مجھے نہیں جانتے اور پھر میرا کام بھی ایسا ہی ہے کہ کسی تیرے آدمی کو بتایا نہیں جا سکتا۔“

اس تیرے آدمی پر مجھے بُخی آگئی اور میں نے کہا۔ ”ابی اور ابی میں، میں اور ابی ایک ہی بات ہے۔“ اور جیسا کہ مجھ پر اعتماد ہونا چاہیے تھا اسے اس بات پر یقین آگیا اور اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے ایک دوست نے اس مرتبہ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دیا ہے اور اس کا پرچہ آپ کے ابی کے پاس ہے۔ مجھے صرف اس کے نمبر معلوم کرنا ہیں۔“ میں نے جہارت سے کام لے کر کہا۔ ”آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں اور اپنے پرچے کو اپنے دوست کا پرچہ کیوں بتاتے ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے میں مسکرا دی اور اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے بڑے مریانہ انداز میں کہا۔ ”کل آپ اپنی بہن کو لے کر یہاں آ جائیے اور اسے مجھ سے متعارف کراؤ۔ مجھے۔ میں ابی سے کہوں گی کہ یہ میری سہیلی ہے اور ان کے بھائی کا پرچہ آپ کے پاس ہے، انہیں نمبر بتاؤ۔ مجھے۔“ خوشی کی ایک لہر دم بھر کو اس کے چہرے پر ابھری اور اس نے کہا۔ ”میری چھوٹی بہن ہے وہ اگر۔“ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”کتنی چھوٹی؟“ تو اس نے بڑی نیاز مندی سے کہا۔ ”فرست ایئر میں پڑھتی ہے۔“ یہ بات سن کر میں بھی اپنی جاہل سہیلیوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

فرخ کی یوں کا خوف آہستہ آہستہ دور ہوتا جا رہا تھا اور اب اس پر صرف سردی کی کلپاہٹ طاری تھی۔ اس لڑکی نے سویٹر کے گھر گن کر کہا۔ ”آپ کو سردی لگتی ہو تو میری شال اوڑھ لیجئے۔“ اور دلبہن نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ ”نہیں!“ لڑکی پھر سویٹر بُختے گئی اور کہنے لگی۔ یہ باتیں توبالکل بے مصرف ہیں کہ نمبر معلوم کرنے کے بعد کس طرح وہ اور اس کی بہن ہمارے یہاں آتے جاتے رہے اور

یا گفت بڑھتی گئی۔ وہ بڑا ہی کمزور طبیعت اور شریف انسان تھا۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھویا رہتا لیکن سوچ کی اوپنی پنجی گھائیوں میں ارادے کی ایک بھی کو نیل نہ پھوٹتی۔ جب ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کی نسبت اس کے پچا کے یہاں ہو چکی ہے تو میں نے پوچھا کہ ”تمہیں میری پکار سنائی نہیں دی تھی۔ میں تمہیں آواز دیتی رہی، سال ہاسال تک تمہارا انتظار کرتی رہی اور تم آئے بھی تو اپنا دام کسی اور کے ہاتھوں میں تھا کر!“ یہ سن کر اس کے آنسو بھر آئے اور وہ جواب نہ دے سکا۔

میں نے اپنی اور ہنی سے اس کی آنکھیں خشک کیں۔ اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے کی پشت سے لگادیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند مہینوں کے بعد اس کے پچا اور ابا کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا اور اس کی منگنی ٹوٹ گئی۔ اس کی بہن اس منگنی کے ٹوٹ جانے سے بہت خوش ہوئی اور بچوں کی طرح بار بار مجھ سے کہنے لگی کہ اس کے بھائی کے لیے اب میں کوئی لڑکی تلاش کروں جس کی شکل مجھ ایسی ہو، قد میرتے جتنا ہو اور رنگ بھی میرے جیسا ہی ہو۔ وہ چند دن ہم تیوں نے بڑی مسرت اور شادمانی کے ساتھ بسر کیے۔ میرے دامن میں اتنی خوشیاں جمع ہو گئیں کہ مجھے ہر لمحہ اپنی جھولی کے پھٹ جانے کا خدشہ ہونے لگا۔ شادمانی کے متعلق میں نے ابی کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا اور وہ میری ضد پوری کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔

ایک دن کیرم کھیلتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ ”تو صیف کتنا پیارا نام ہے۔ چھوٹے بچے کا اس سے پیارا نام اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“ وہ سوچنے لگا تو میں نے کہا۔ ”یوں لگتا ہے ناجیے تو صی کر کے سڑا ٹکر کیرم کی گوئیں نکال کر بھاگ گیا۔ لڑکی نے چھوٹے سے سویر کو پھر لڈو سا ایک بچہ کیرم کی گوئیں نکال کر بھاگ گیا۔ لڑکی نے چھوٹے سے سویر کو انگلیوں سے ناپ کر دیکھا اور کہا۔ ”معاف کجھے گا۔ پتہ نہیں میں کیوں بغیر اجازت اندر چلی آئی اور آپ سے پوچھے بنا یہ داستان بھی بیان کرنے لگی۔ شاید آپ کو میری یہ باتیں بہت ہی ناگوار گزر رہی ہوں۔“

فرخ کی بیوی نے پھر نفی میں سر بلایا اور وہ لڑکی کہنے لگی۔ ”اس دن کے بعد

سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں زندگی بھر تو شے بلے کو آوازیں دیتی رہی ہوں۔ اسی کو پکارتی رہی ہوں اور میرے ہاتھوں میں شہد کے پیالے یا میرے کندھے پر مشکیزہ کبھی بھی نہیں ہوا بلکہ میں اپنے گھر کے دروازے پر اس کے تنخے بوٹ تھام کر اور کندھے پر اس کا چھوٹا سا سویٹر ڈال کر تو شے بلے کو بلا تی رہی ہوں جو سردی کے دنوں میں گلی کے بچوں سے کھلیل رہا ہوتا تھا!

پھر وہ ذرا رکی اور دیوار پر نگاہیں جما کر کہنے لگی۔ ”میرا ب بھی یہی ایمان ہے کہ انسان کا نات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ ستاروں پر کندھا ڈال سکتا ہے، پہاڑوں کے دل چیر دیتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر قوت کو مختصر کر لیتا ہے لیکن جذبہ آفرینش کی رو کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بہا سکتا اور فطرت کے تخلیقی منصوبوں میں دخل نہیں دے سکتا۔ تو شے بلے کی مجھے ضرورت تھی، مادر فطرت کو نہ تھی۔ چچا کے یہاں نسبت ٹوٹنے کے بعد اس کے والد کو تجارت کا شوق چرایا اور انہوں نے اپنے بیٹے کی بات اپنے شریک کار کے یہاں پھرہا دی۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے سب سے منہ موڑ لیا حتیٰ کہ اپنے پیارے ابی کو بھی عمر بھر کے لیے روتاڑ ھوتا چھوڑ کر مادر فطرت کو سمجھا نہ لگی۔ جانتی ہوں قدرت مجھ سے قوی تر ہے لیکن میں بھی بڑی ضدی ہوں اور خود سر ہوں۔

اور آج آپ لوگوں کی طرح میں بھی یہاں ہنی مون منانے آئی ہوں۔ تو شے بلے میرا بچتے ہے۔ میرا بچتے ہے۔ میرا بچتے!۔ ”اس نے سلاپیوں میں دیا ہوا سویٹر اپنے سینے سے لگایا اور سکیاں بھرنے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور فرخ کی بیوی دیوانوں کی طرح ڈرائیگ روم کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھول کر وہ فرخ سے لپٹ گئی اور چیخ کر کہنے لگی۔ ”وہ کہتی ہے تو شے بلے میرا بچتے ہے۔ میرا بچتے ہے۔“

یہ نام سن کر فرخ ٹھٹکا اور دودھ کا جگ زمین پر رکھ کر اندر اس کمرے میں گیا۔ عقی جل رہی تھی، کر سیبوں پر میلے کپڑے جھاڑنوں کی طرح پڑے تھے اور سنگار میز کے آئینے میں اس کا اپنا عکس اسے گھور رہتا تھا۔

## صدر ٹھیلا

صدر ٹھیلا مر گیا اور مجھے مرننا ہے لیکن کوئی چاہے مجھے تھوڑے تیروں سے اڑا دے۔ پچھی بات میں کہوں پر کہوں اور مجھے ڈر بھی کس بات کا۔ بہت سے دوست مر کھپ گئے۔ کئی ایک سرحد کے اس پارہ گئے اور جو باقی نیچے، ان کا پتہ نہیں۔ کوئی پورب میں ہو گا، کوئی پچھم میں۔ نہ کسی کوئی نے یاد کیا اور نہ کسی نے مجھے یاد کرنے کی زحمت کی ہوگی۔ ایک زمانہ تھا جب ہم سکول میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ ٹولیاں بنانے کر بیر اور ہولیں کھانے جایا کرتے تھے اور مل جل کر ریل کے آواز گنل میں ایٹھیں پھنسا کر رکتی ہوئی گاڑی کی سیٹیاں سنائیں کرتے تھے۔ مسافروں کو کھڑکیوں سے سر نکال کر جھلاتے اور جھنچھلاتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور تالیاں بجاتے تھے لیکن اب تو زمانہ ہی بدلتا گیا۔ اب گاڑی گنل سے باہر رکتی ہے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ایسی الجھن ہونے لگتی ہے کہ ڈبے سے اتر کر پیدل چلنے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں اگر کوئی راہگیر رکتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر مسکراتا ہے تو اس کا گلا گھونٹ دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی نوزاںیدہ مسکراہٹ پر کچھ مل دینے کی خواہش ہوتی ہے لیکن افسوس ہو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ گاڑی رکی رہتی ہے۔ سیٹیاں بجا کرتی ہیں اور راہگیر مسکرائے جاتا ہے۔ جب ہم سرگنوں گنل کی آہنی سلاح کو ”زور لگاؤ بھیا“ کہہ کر اوپر اٹھاتے اور اس کے نیچے ایٹھیں پھنساتے تھے تو سب کچھ ہو جاتا تھا۔ اس وقت ہم بیبا ہیبا کے سوا کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اب افسوس اور تاسف کے سوا کسی چیز کی بھی خبر نہیں! دون بھر میں جس قدر شرارتیں ہوتیں جتنے فتنے برپا کیے جاتے، ان میں حبیب ٹینی کا بڑا تھا ہوتا۔ میکانی شرارتیں اس کی گھٹی میں پڑی تھیں اور ہر روز کوئی نہ کوئی انوکھی شرارت سوچ کے آتا۔ ہمیں ترکیب بتاتا اور خود

بالکل علیحدہ ہو کر تماشائی کی حیثیت سے نظارہ کیا کرتا۔ تحقیق ہوتی، ہم پکڑے جاتے۔ ہیئت ماسٹر صاحب کے ہاں پیشی ہوتی۔ بید جھپٹ جھپٹ کر ہماری ہتھیلوں کو بو سے دیتا اور ہم بغلوں میں ہاتھ دبا کر انپی کلاسوں میں چلے جاتے اور حبیب ٹینی نئی شرات کے بارے میں سوچنے لگتا۔ پچھی پر قدم بالکل گدھا آدمی تھا۔ اللہ میاں نے تو اسے محض بیلوں کی دم مر وڑنے اور ہل چلانے کے لیے پیدا کیا تھا مگر والدین کی قسم ظرفی کہ اسے مدرسے بھجو کر ہماری جانوں کے لیے مستقل عذاب بنادیا تھا۔ پچھی ہر شرлат میں حصہ لیتا اور ضرور پکڑا جاتا۔ معمولی سے معمولی ماسٹر کی ہلکی سی ہلکی گھر کی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا اور ہم سب کو پکڑوا دیتا۔ ہم نے متین کیس، ہاتھ جوڑے، پر پچھی نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا اور حسب توفیق ہماری مصیبتوں میں اضافہ کرتا ہی رہا۔ برکت مہاشا، انور طوطا اور مدن بکھی کئی مرتبہ اس سے دست و گریاں ہوئے۔ اس کی اچھی خاصی مرمت بھی کی لیکن اس نے پارٹی کی خدمت کو عین سعادت سمجھا اور ہمارے ساتھ چپکا رہا۔

صدر ٹھیلہ ہمارا یا ر تھا لیکن اس نے ایسی شراتوں میں کبھی حصہ نہ لیا۔ وہ ہر معمر کے پر ہمارے ساتھ ہوتا، پرے بیٹھ کر آرام سے مساوک کیے جاتا اور استرا پھیرے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ جب میں دسویں میں آیا تو وہ میزک کا امتحان تیسرا مرتبہ دینے والا تھا۔ ریاضی میں صفر اور انگریزی میں دس پندرہ نمبر سے بھی آگئے بڑھ سکا۔ اردو فارسی میں پاس ہو جاتا اور تاریخ کے پرچے میں ہمیشہ اول آثار رہا۔ سارا سکول اس سے خوف کھاتا تھا۔ لڑکے باری باری سے تفریح کے گھنٹے میں اس کے گھر سے کھانا لاتے، اس کے لیے مساوکیں بناؤ کر لاتے اور چھٹی کے وقت جب وہ سیدھا اکھاڑے جاتا تو لڑکے ہی اس کا بستہ چھوڑنے گھر جاتے۔ ہمارے ہیئت ماسٹر صاحب پنڈت امرنا تھے صاحب بڑے کڑے کڑے آدمی تھے۔ سکول میں کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہ کرتے۔ کوئی لڑکا بھولے سے منوعہ گر اس پلات میں پاؤں رکھ دیتا تو ایک درجن بیدے سے کم اس کی تواضع نہ ہوتی لیکن صدر ٹھیلے سے وہ بھی دبتے تھے۔ اگر کبھی اس کو سزا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو مولوی ابو الحسن صاحب سے کہتے۔ مولوی صاحب ٹھیلے کو کان سے پکڑ کر کشاں کشاں دفتر میں لے جاتے اور پنڈت جی کی میز کے

سامنے کھڑا کر کے اپنے مخصوص لمحہ میں کہتے۔ ”نالائق خبیث تو بہ کر، معافی مانگ پنڈت جی سے۔ نہیں تو جان سے مار دوں گا۔“ اور ٹھیلا ہنٹے ہوئے کہتا۔ ”تو بہ جی پنڈت جی، معافی دے دو جی۔“ اور پنڈت جی معاف کر دیتے۔

ایک مرتبہ سکول کا چپڑاں ڈاک لے کر پوسٹ آفس جا رہا تھا صدر ٹھیلے نے آواز دے کر کہتا۔ ”دیوان چند میرا خط بھی لیتے جانا۔“ دیوان چند ایک لمحے کے لیے رکا، پھر پلٹ کر بولا۔ ”سرکاری کام سے جا رہا ہوں، فرصت نہیں۔“ صدر نے دو زقدیس بھر کر جادبو چا اور اس کی ناک پر اپنے ہتھوڑے ایسے سر کی ایسی ٹکر جہائی کہ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ چپڑاں نے ڈاک زمین پر بھینک دی اور بھیں بھیں رو نے لگا۔ ہائے تھانے جاؤں گا، پولیس بلاوں گا۔ ہائے تھانے جاؤں گا۔ ”ٹھیلے نے اسے چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا اور چھائی پر سوار ہو بیٹھا۔ لہو لہاں چہرے پر زنانے کا طمانچہ رسید کرتا اور کہتا۔

”لات کے پاس جا کتے ہیں میں تجھ سے ڈرتا ہوں۔“ کتنا بنیا نچے پڑا ہوا تھا جوڑ رہا تھا اور ٹھیلا چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اور بکھری دوڑے دوڑے گئے تو اس نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک کر کہتا۔ ”مولوی دوڑ جا، تجھے بھی مار بیٹھوں گا۔“ میں تو ایک طرف دبک گیا مگر بکھری اس سے لپٹ گیا اور کہنے لگا۔ ”جا بڑا معتبر مار بیٹھے گا۔ اب تجھے نہ چھوڑوں گا۔“ مدن بکھری چھفت لمبا سر کنڈا تھا۔ پگڑی جو توں سمیت کوئی سات سو اسات سیر وزن ہو گا لیکن تھا بڑی حصہ کا آدمی۔ ٹھیلے نے پہلے تو اسے قہر بھری نظر وہ دیکھا، پھر نہ پڑا اور اسے موٹی سی گالی دے کر کہتا۔ ”لے جاں خزر کو میری آنکھوں سے دور۔ نہیں تو حلال کر دوں گا کتے کو۔“ بکھری چپڑاں کو اٹھا کر غل کی طرف لے چلا لیکن وہ اپنی کلامی چھڑوا کرد فتر کی طرف بھاگا اور شور مچانے لگا۔ پنڈت جی نے مولوی ابو الحسن صاحب کو بلا کر دیوان چند کی حالت دکھائی اور ٹھیلے کو فور اسزاد ہینے کی تلقین کی۔ مولوی صاحب ململ کا کرتا اور ٹخنوں سے اوچا پا تجہام پہنچنک کر باہر نکلے۔ ٹھیلے کو بلا نے کے لیے مجھے بھیجا۔ صدر اس وقت نک شاپ پر لسی پی رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر بولا۔ ”آیا مولوی غصہ تھوک دے، لسی پی۔“ میں نے نہیں کر کہتا۔ ”چل تیرے لیے بھی لسی تیار ہے۔ مولوی جی تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ مولوی جی بلا تھے ہیں۔“

اس نے گلاں وہیں چھوڑ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ غصے

میں تو نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”زیادہ غصے میں! آج تو وہ تیری ہڈی پسلی تو زڈالیں گے۔“  
میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ ذرا جھکا اور رازدارانہ لبجھ میں کہنے لگا۔ ”بھلا مولوی جی  
کی پیش کب ہو گی؟“ میں نے کہا ”جب تک تو پاس نہیں ہوتا، مولوی جی کی پیش  
نہیں ہو سکتی۔ مولوی جی نہ ہوں تو تو سکول کوپانی بنادے۔“

ٹھیلیا ہنسا اور ماسٹر ایشہ داں کو ادھر آتے دیکھ کر بولا۔ ”میں تو ماسٹر ایشہ  
داں سے بھی بہت ڈرتا ہوں۔“ اور جب ماسٹر جی ہمارے محاذ میں آگئے تو ٹھیلیا نے  
کہا۔ ”کیوں ماسٹر گڑپنگھ میں تجھ سے بھی ڈرتا ہوں نا؟“ ماسٹر جی نے تیوری چڑھائی اور  
منہ ہی منہ میں گالیاں دیتے ایک طرف نکل گئے۔

مولوی ابوالحسن صاحب کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک لپکدار چھڑی تھی اور  
ڈرل گراونڈ میں کھڑے غصہ میں کانپ رہے تھے۔ میں ٹھیلیا کو ساتھ لے کر آیا تو وہ  
چیل کی طرح جھپٹے اور پٹے کے ہاتھ چلانے شروع۔ ٹھیلیا جھوٹ موث مر گیا جی۔ ہائے  
مر گیا جی کہہ رہا تھا اور مولوی جی اسے عربی فارسی کی متروک گالیاں دیئے جا رہے تھے۔  
سب لڑکے کلاس میں چھوڑ کر باہر بھاگ آئے۔ ماسٹر صاحبان انہیں دروازوں سے ہٹا کر  
اندر کلاسوں میں لانے کے لیے باہر نکلے تو گراونڈ کے ڈرامچے میں ایسے محو ہوئے کہ  
انہیں اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ وہ لڑکے جنہیں صدر ٹھیلیا و قتاو قتا پیٹتا رہتا تھا، اس سزا پر  
سب خوش ہوئے۔ ان سب نے مل کر مولوی ابوالحسن صاحب زندہ باد کا نفرہ بلند کر  
دیا۔ اس نفرے نے ماسٹروں کو چونکا دیا اور وہ اپنی کلاسوں کو گالیاں دیتے ہوئے کمروں کی  
طرف ہائنسے لگے۔ مولوی صاحب کمزور چرخ ہاتھوں سے صدر پر قمیاں بر سارے ہے  
تھے۔ ان کا دم پھول چکا تھا اور اب ان سے بات بھی نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے چھڑی  
پرے پھینک کر کہا۔ ”زمین پر ناک سے چھ لکیریں نکال۔ ابھی اسی وقت نہیں تو نہیں  
توڑوں گا۔“ صدر ٹھیلیے نے فقرہ ختم ہونے سے پہلے دونوں گھٹنے زمین پر بیک دیئے اور  
گراونڈ پر ہٹھیلیاں جما کر لکیریں نکالنے لگا۔ لکیریں نکل چلیں تو مولوی جی اسے کان سے  
پکڑ کر حسب دستور و فترت میں لے گئے اور پنڈت جی کے سامنے ہاتھ جڑوانے لگے۔  
انور طوطے اور برکت مہاشے کو مولوی صاحب ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور

وہ حبیب ثینی سے مولوی صاحب کو سزا دینے کی ترکیبیں پوچھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ثینی نے انور طوطے کو ایسی دوالا کر دی جس کے لگاتے ہی داڑھی کے بال و منہ میں جھٹر جائیں تو صدر ٹھیلے کو پتہ چل گیا۔ اس نے برکت مہاش کی رانوں اور پنڈلیوں پر ہاکیاں مار مار کر سارا رازِ الگوایا اور ثینی اور طوطے کی وہ مرمت کی کہ ہم سب نے ٹھیلے سے بائیکاٹ کر دیا اور تین چار روز تک تو ہم اس سے کنی کاٹ کر گزرتے رہے۔ اس کے بعد ہم نے اس کے خلاف کھلم کھلا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ہمارے اس متحده مجاز میں ماشر گڑگا بھی شریک ہو گیا اور ہماری کارروائیوں کو ہوادیتا رہا۔ پنڈت جی ہمارے ساتھ بھلے مانسوں کا سلوک کرنے لگے اور ہم سکول کے معتبر لذکوں میں سے ہو گئے اور وہ لڑکے جو ہم سے بولنا بھی پسند نہ کرتے تھے، ہمارے دوست بن گئے۔ اب ہم نک شاپ میں ناٹکیں پسار کر لئی پیتے، گراونڈ میں چوکڑی جما کر تاش کھیلتے اور لڑکوں کی ٹوبیاں اتار کر درختوں پر اچھال دیتے۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی جو شکایت کرتا۔ کسی کی جرأت نہ تھی جو شکایت پر کان دھرتا۔ صدر ٹھیلیا بدستور سکول آتارہا اور اپنے سب سے آخری ڈسک پر سر جھکائے جاؤسی ناویں پڑھتا رہا۔ نہ کوئی ماشر اسے بلا تا، نہ کوئی لڑکا اس سے گفتگو کرتا اور نہ ہی وہ کسی سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔

چھپی پریتم ایک جاث اوپر سے عورتوں کی سی مت۔ جس ماشر سے ملتا بڑی بے تکلفی سے پیش آتا۔ اکثر کلاس میں ایسی بے ہودہ بات کرتا کہ سارے لڑکے کھلکھلا کر نہیں دیتے اور ماشر صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے۔ ایک دن دوپہر کے وقت وہ گپڑی بغل میں دبائے ممنوعہ گراس پلات میں اتر کر پھول توڑ رہا تھا کہ پنڈت جی آگئے۔ انہوں نے کڑک کے پکارا، تو اپنے جوڑے میں پھول ناکرنے ہوئے بولا۔ ”آیا بادشاہ ہو۔“ پنڈ لڑکے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر تماشا دیکھنے لگے۔ پھر ماشر صاحب نے آؤ دیکھانہ تاؤ، جاتے ہی اس کی خبر لینی شروع کر دی۔ چھپی کا جوڑا کھل گیا۔ گپڑی پرے جا گری اور وہ بڑے اکھڑے لجھے میں ”ٹھہر جاؤ بادشاہ ہو، صبر کرو بادشاہ ہو“ کے نفرے لگاتا گیا۔ پنڈت جی چڑگئے اور انہوں نے تابڑ توڑ بید برسانے شروع کر دیئے۔ ہم میں سے کسی کی جرأت نہ تھی کہ چھپی کی مدد کرتا۔ ہر ایک اسی کو برا بھلا

کہہ کر اپنی جگہ پر دیک گیا۔ صدر ٹھیلے نے جب یہ تیج و پکار سنی تو بگولے کی طرح کلاس سے نکلا اور جا کر پنڈت جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ تیج و تاب کھا کر رہ گئے اور سرخ آنکھوں سے ٹھیلے کو گھورتے دفتر میں چلے گئے۔ صدر نے زمین سے پچھی کی پکڑی انھائی اور پلاٹ میں بکھرے ہوئے پھول پھنے اور پرستیم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باہر لے گیا۔

اس واقعہ کے بعد صدر پھر ہمارا دوست بن گیا۔ ہم باری باری اس سے گلے ملے۔ ٹینی اور طوطے سے اس نے کان پکڑ کر معافی مانگی۔ برکت مہاشے کی کمر میں زور کا دھمکا مار کر بولا۔ ”موٹے مہاشے، اب بھی ناراض ہو تم؟“ مہاشہ ہنس پڑا تو ہم سب نے نیک شاپ پر جا کر پیڑوں والی لسی کے دودو گلاس پے اور پیسے پچھی کے نام لکھوا دیئے۔

صدر ٹھیلائیل پر بیٹھا دانت صاف کر رہا ہوتا اور پنڈت جی ادھر آنکتے تو وہ کسی نہ کسی کو مخاطب کر کے کہتا۔ ”اس کی موت میرے ہاتھوں آئے گی۔ چنانی الگ جاؤں گا، پر اس کا خون کر کے رہوں گا۔ بھلا اس نے پچھی کو کیا سمجھ کے مارا۔“ ہر روز ایسی ہاتھیں سن کر پنڈت جی محتاط ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بہانے بہانے ٹھیلے کے ایسے فقرے مولوی ابو الحسن صاحب کے گوش گزار بھی کیے۔ مولوی صاحب نے حسپ عادت ٹھیلے کو طمانچے مار مار کر اس کے منصوبوں کے بارے میں کئی مرتبہ پوچھا لیکن وہ مکرتا ہی رہا اور قسمیں کھا کر یقین دلاتا رہا کہ اس کا کوئی ارادہ نہیں، کوئی منصوبہ نہیں۔

ہمارے سالانہ امتحانات میں کوئی دو مہینے ہوں گے کہ ہفتے کے روز ٹینی کا چھوٹا بھائی اس کے ساتھ سکول میں آیا اور بھائی کے ساتھ کلاس میں بیٹھنے کے لیے ضد کرنے لگا۔ ٹینی نے اسے سمجھایا۔ گھر کیاں دیں۔ منتیں کیں اور ایک آذھ تھپڑ بھی لگادیا مگر وہ بضدرہ اور ٹینی کو اسے اپنے ساتھ کلاس میں لے جانا ہی پڑا۔ ماسٹر گذپنکھ کا پیر یہ تھا۔ انہوں نے ٹینی کے ساتھ ایک بچے کو بیٹھنے دیکھ کر حبیب سے اس کے بارے میں پوچھا تو حبیب نے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”جی یہ میرا بھائی ہے اور۔“ لیکن گذپنکھ کے نے اس کی بات تیج میں کاٹ دی اور دروازے کی طرف انگلی تان کر کہنے لگا۔ ”اے باہر لے جاؤ۔ یہ سکول ہے، تمہاری خالہ کا گھر نہیں۔ جاؤ۔“ ٹینی نے اپنے بھائی کو بازو سے

پکڑ کر او پر اٹھانا چاہا تو پچھے سہم کر اس کی ٹانگوں سے چھٹ گیا۔ ماسٹر جی نے میز پر روپ بجا کر کہا۔ ”جاوہ جاؤ لے جاؤ۔“ اس حکم کے جواب میں صدر ٹھیلیا اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹینی کی سیٹ پر آیا۔ اس کے بھائی کو اپنے ساتھ اپنے ڈسک پر لے گیا اور اپنے کدوایے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ ”لوماسٹر صاحب! اب شروع کرو اپنا کام۔“ کلاس ہنس پڑی اور ماسٹر جی رجڑا اٹھا کر باہر نکل گئے۔ برکت مہاشے نے زور سے سیٹی بجا کر کہا۔ ”لو جی ہمارے چھوٹے بھائی کو نکالنے آیا تھا۔ اب لالہ جی کی اپنی ارتھی نکل گئی۔ رام رام ست ہے!“ لڑکوں نے چھینیں ماریں، ڈسک بجائے اور اونچے اونچے ٹسروں میں گانا شروع کر دیا۔ ”جائے پنڈت تیری تو مژی گنگانوں۔“

پنڈت جی دفتر سے برآمد ہو رہے تھے لیکن یہ کورس سن کر واپس لوٹ گئے۔ انہوں نے جانا کہ چند لمحوں کے بعد یہ طوفان بد تیزی آپ سے آپ تھم جائے گا۔ جس استاد نے کلاس کو اس طرح چھوڑ دیا ہے، وہ بدنظمی کے خوف سے خود ہی آکر اسے سنبھالے گا لیکن یوں نہ ہوا۔ تقریباً آدھی کلاس باہر نکل گئی۔ صدر ٹھیلیا، حبیب ٹینی کے بھائی کا ہاتھ تھامے اسے روشنوں پر لیے پھر تھامہ اور ان دونوں کے ساتھ ٹینی کے علاوہ جماعت کے اور بہت سے لڑکے بھی تھے۔

جب پنڈت جی کو لڑکوں کے کلاس چھوڑ کر باہر آجائے کا علم ہوا تو وہ بیدہاتھ میں لے کر غصے سے کانپتے ہوئے دفتر سے نکلے۔ اس وقت صدر ٹھیلیا منوعہ گراس پلات سے پھول توڑ توڑ کر حبیب ٹینی کے بھائی کی جھوٹی بھر رہا تھا۔ پنڈت جی بیدہاتھوں میں قرخرا تھا، نئھنے پھڑکاتے پلات میں داخل ہوئے اور آتے ہی ٹھیلیے کے کمر میں پورے زور سے چھڑی جزدی۔ اس نے تملکا کرالٹ کر دیکھا اور جھپٹ کے بید پکڑ لیا اور پھر ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں چونکہ چھڑی کا چڑاوا لا موٹا سرا تھا، اس لیے وہ بید چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ لڑکوں نے زور سے تالی بھائی۔ ”پنڈت جی زندہ باد۔ ہپ ہپ ہرے، ہپ ہپ ہرے۔“ لیکن ہماری ساری پارٹی بڑی خفیف ہوئی اور ہم میں نے ہر ایک تالی بجانے والوں کو گھوڑنے لگا۔ پنڈت جی نے منہ ہی منہ میں گالی دے کر ٹھیلی سے کھل۔ ”نکل جاؤ۔“ ابھی اسی وقت نہیں تو پولیس بلاؤں گا۔“

ٹھیلیا حبیب ٹینی کے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر پلات سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم

اٹھاتا سکول سے باہر نکل گیا۔

وہ شام قیامت کی شام تھی۔ ہم سب ٹھیلے کی قیادت میں شہر سے دو میل دور سڑک کے کنارے بھوروں کے جھنڈی میں آنے والے واقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔ پچھی پریتم نے اپنے جوڑے پر رومال کس کر باندھا ہوا تھا۔ اس میں اتنی پینی لگارکھی تھیں کہ جوڑا پن کش بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک چھڑی تھی جس پر وہ چاقو سے مسلسل رنده کیے جا رہا تھا۔ صدر کے ہاتھ میں بھلی کی بل کھائی ہوئی تار تھی جسے اس نے اپنی کلامی کے گرد لپیٹ کر رہا تھا میں پکڑا ہوا تھا۔ برکت مہائے کے پاس پیتل کی ایک چھوٹی سی پھنکنی تھی جو وہ اپنے ساتھ گھر سے لے کر آیا تھا۔ اس نے وہ پھنکنی منہ کے آگے لگارکھی تھی۔ اس میں آہستہ آہستہ پھونک رہا تھا۔ انور طوطا خالی ہاتھ تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں بڑا کرت بھل۔ جسے چاہتا کلامی پکڑ کر ایسی پٹختی دیتا کہ گرے ہوئے کو گھنٹہ بھر ہوش نہ آتا۔ میری گود میں ایک ہاکی سنک پڑی تھی اور میری ٹانکیں کانپ رہی تھیں۔ صدر بار بار میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ ”ذر نہ تیرا تو اس میں کام ہی تھوڑا سا ہے۔“ اور میں زبردستی مسکراتے ہوئے کہتا۔ ”کون بھڑواڑتا ہے ٹھیلے چاہے تو پ کے آگے باندھ دے۔“

”شاباش۔“ وہ میرا کندھا تھپک کر کہتا۔ ”تو بے جگڑا، تیرا باپ سورما۔ بھلا تجھے ڈر کس بات کا۔“

ہم پنڈت کی بگھی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ روزانہ شام کو سیر کے لیے نکلتے۔ چمکدار بگھی میں عربی گھوڑی سڑک پر ٹاپیں مارتی، کنو تیاں گھماتی لہر کی طرح آگے بڑھتی جاتی۔ اگلی سیٹ پر بھیارا میں سہارے گھنٹی بجا رہا ہوتا اور پچھلی نشست پر پنڈت جی ٹانکیں پھیلائے بیٹھے ہوتے۔ پنڈت جی بلانامہ شہر سے باہر پانچ چھ میل تک گھوڑا گازی میں جاتے اور ایک آدھ گھنٹہ ہرے ہرے کھیتوں میں چھل قدمی کرنے کے بعد واپس آ جاتے۔ تبی ان کا دلچسپ مشغله تھا اور تبی ایک ایسی ورزش تھی جسے وہ ہر چیز پر فویت دیتے۔

اس وقت ہم پنڈت جی کی بگھی کا انتظار کر رہے تھے اور صدر ٹھیلے کی بے عزتی کا بدلہ چکانے بیٹھے تھے۔ صدر خود سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر بگھی روکنے والا تھا۔ انور طوطے کے ذمے بھیا کو چوان کو گردن سے پکڑ کر نیچے گرانے کی ڈیوٹی

تھی۔ دونوں پہیوں کے آگے اینٹیں رکھنے کا ذمہ دار برکت مہاشاتھا اور مجھے یہ حکم تھا کہ ہاکی سنک سے گھوڑی کی نانگوں پر پے در پے ضریب لگاتا جاؤ۔ باقی لوگ کمک کے طور پر تھے کہ جو نبی ضرورت محسوس ہو تو سیٹی بجا کر انہیں بلا لیا جائے۔ صدر کو مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ ہنس ہنس کر کہتا۔ ”مولوی گھبرا نے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں چاہیے کچھ ہی ہو تم گھوڑی کی نانگوں پر نوبت بجاتے جانا۔“ پھر خود ہی سوچ کر کہتا۔ ”پریار تجھ سے نوبت نہ بکے گی۔ تو ذرا زیادہ ہی سیانا ہے اور سیانوں نے بڑے گھر گالے ہیں۔ اگر ارادہ نہ ہو تو اب بتادے، وقت پر جھیلے میں نہ ڈال دینا۔“ میں چہرے پر غصے کے بنادی آثار پیدا کر کے کہتا۔ ”بکواس نہ کر۔ تو نے مجھے کہیں سمجھ رکھا ہے کہ بزدل؟“

صدر کہتا۔ ”نہ تو بزدل ہے، نہ کہیں۔ ذرا مولوی ہے نا اس لیے تشوش ہے۔“ ”بس ایک بات یاد رکھنا۔ کچھ ہی ہو، ہم مریں یا جیسیں تم اپنی کارروائی کیے جانا۔“ میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور مینڈھ پر پڑے ہوئے ایک بڑے سے ڈھیلے کو اپنی لکڑی سے پھوڑنے لگا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ نارنجی روشنی سرمنی ہوتی جا رہی تھی اور ہم سب اپنے اپنے ہتھیار سجائے کھجوروں کے جھنڈ میں ٹاپ پر کان لگائے میٹھے تھے۔ دفعتہ صدر نے لوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ پنڈت جی کی گھوڑی کھلے کھلے قدم پھینکتی چلی آتی تھی۔ اور وہ کا حال مجھے معلوم نہیں، میرا دل ہر ٹاپ کے ساتھ ٹوٹی ہوئی ڈول کی طرح کھڑکڑا تا شور مچاتا کنویں میں لپک رہا تھا اور کنوں ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

اچانک ڈکی پویہ میں تبدیل ہو گئی اور ہم صدر کے اشارہ پر انٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بجلی کی تار کو بل دیتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ گھوڑی پویہ سے سر پشت ہو گئی۔ صدر ہمیں اشارہ کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ تار کے بل اپنی کلانی سے کھول رہا تھا اور پکار رہا تھا۔ گھوڑی بے قابو ہو گئی۔ تار کھول کر اس نے پرے پھینکی اور ڈھیریاں اُلانگتا مینڈھیں پھلا لگتا دنوں ہاتھ اٹھا کر سڑک کے پیسوں چک کھڑا ہو گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے بھاگ گے، گھوڑی خوفزدہ ہو کر بھاگ رہی تھی۔ بگھی کا